جنوری - مارچ ۲۰۱۹ء

قتل کے مقدمات میں معافی اور صلح: چند اہم مسائل کا تجزیہ

Pardon and Compromise in Murder Cases: Analysis of few Important Issues

Dr. Mushtaq Ahemad*

Abstract

The offence of murder in Pakistan before the promulgation of Qisas and Diyat Ordinance was non compoundable and like other crimes; only the state owned the right to pardon in these cases. Now in light of the principles of Islamic law, under section 309 of PPC (Pakistan Penal Code), the right of pardon is given to affected party or relatives of the deceased. Federal Shariat Court has also acknowledged this principle that the state cannot pardon the accused for punishment of Qisas without the consent of wali of the victim. Though under Article 45 of Constitution of Pakistan 1973, head of the state can pardon any punishment, and it is a known fact that Constitution of Pakistan has supremacy over PPC, therefore head of the state can pardon a murderer or decrease in degree of punishment without the consent of heirs of the victim.

Few people have condemned the law that this amendment has paved the way for honor killing because, for example if a brother in aggression kills his sister in the name of honor and father of the girl being heir of the victim has right to pardon his son (murderer) and he normally does this. Similarly, according to section 310 of PPC, the offence of murder has become compoundable. There is another objection on this section that, if heirs of the victim are deprived ones, and murderer belongs to an influential family so they compel heirs of the victim to compromise through force or bribe. In this research study, the above mentioned issues shall be highlighted.

Keywords: Pardon, Murder, Qisas, Diyat, Ordinance

* Director General Shariah aAcademy International Islamic University,Islamabad

پاکستان میں قصاص ودیت کے قانون کے نفاذ سے پہلے قتل کا جرم ناقابل راضی نامہ تھا،اور دیگر جرائم کی طرح اس جرم میں معافی کا اختیار صرف ریاست کے پاس تھا۔اب اسلامی قانون کے قواعد کی روشنی میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۹ میں طے کیا گیا ہے کہ عفو کا اختیار مجنی علیہ ، یا اس کی عدم موجودگی میں اولیاء الدم، کے پاس ہے۔وفاقی شرعی عدالت نے بھی اس اصول کی توثیق کی ہے کہ قصاص کی سزا کو ولی الدم کی مرضی کے بغیر ریاست معاف نہیں کر سکتی۔تاہم دستور کی دفعہ ۴۵ کے تحت سربراہ ریاست ہر سزا کو معاف کر سکتا ہے اور چونکہ دستور کو تعزیرات پاکستان پر بالادستی حاصل ہے اس لیے سربراہ ریاست ولی الدم کی مرضی کے بغیر بھی قاتل کو معاف کر سکتا ہے، یا اس کی سزا میں تخفیف کر سکتا ہے۔چنانچہ پرویز مشرف نے اولیاء الدم کی مرضی کے خلاف مرزا طاہر کی سزا میں تخفیف کر کے اسے عمر قید میں تبدیل کر دیا تھا۔

بعض لوگوں نے عفو کا اختیار مجنی علیہ اور اولیاء الدم کو دینے پر سخت تنقید کی ہے۔عام طور پر کہا جا تا رہا ہے کہ اس ترمیم نے غیرت کے نام پر قتل کے لیے راستہ کھول دیا ہے کیونکہ اگر مثال کے طور پر کوئی شخص اشتعال میں آ کر اپنی بہن کو قتل کرے تو باپ ولی الدم ہونے کی وجہ سے معافی کا اختیار رکھتا ہے اور وہ بالعموم اپنے بیٹے کو معاف کر دیتا ہے۔[1] اسی طرح تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۱۰ کے مطابق قتل کا جرم قابل راضی نامہ ہو چکا ہے۔اس شق پر ایک عام اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر مقتول کے ورثا کمزور ہوں اور قاتل کا خاندان بااثر ہو تو وہ ورثاء کو دھونس کے ذریعے یا لالچ دے کر صلح پر آمادہ کر لیتے ہیں۔اس مختصر مقالے میں اسی مسئلے کے بعض اہم پہلوؤں پر بحث کی جائے گی۔

دستورِ پاکستان کی دفعات کے درمیان تصادم

یہ بات صحیح ہے کہ دستور کو تعزیرات پاکستان پر بالادستی حاصل ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خود دستور میں قرآن وسنت کی بالادستی کی بات کی گئی ہے ، بالخصوص جبکہ قرارداد مقاصد کو ، جس میں خدائے تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ (sovereignty) کا اقرار کیا گیا ہے ، دفعہ ۲۔الف کے ذریعے دستور کا باقاعدہ حصہ بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ "حاکم خان کیس"[2] میں سپریم کورٹ نے قرار دیا ہے کہ دستور کی دفعہ ۴۵ کا تصادم دستور ہی کی دفعہ ۲۔الف کے ساتھ بھی ہے کیونکہ دفعہ ۲۔الف کے تحت اللہ تعالیٰ کا قانون بالادست ہے جس کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ قصاص میں مجنی علیہ یا ولی الدم معافی کا اختیار رکھتا ہے، جبکہ حدود میں کسی کے پاس معافی کا اختیار نہیں ہے۔نہایت افسوسناک امر یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے یہ طے کرنے کے بعد

---

[1]۔عفو کے اختیار کے غلط استعمال کے سدباب کے لیے ۲۰۰۵ء میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۱۱ میں ترمیم کی گئی۔پہلے اس دفعہ میں قرار دیا گیا تھا کہ ولی الدم کی طرف سے معافی کے باوجود جرم کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے "فساد فی الارض" کے خاتمے کے اصول کے تحت عدالت قاتل کو چودہ سال تک قید کی سزا سنا سکتی تھی بشرط یہ کہ اسے تمام اولیاء الدم نے معاف نہ کیا ہو۔اب ترمیم کے بعد قرار دیا گیا ہے کہ اس صورت میں عدالت سزائے موت یا عمر قید کی سزا بھی سنا سکتی ہے۔مزید برآں، قرار دیا گیا ہے اگر یہ قتل غیرت کے نام پر کیا گیا ہو تو قاتل کی سزا دس سال قید سے کم نہیں ہو گی۔واضح رہے کہ اس دفعہ کے آخر میں "فساد فی الارض" کی جو وضاحت پیش کی گئی تھی اس ترمیم کے بعد غیرت کے نام پر قتل کو بھی اس کے مفہوم میں داخل کر دیا گیا ہے

[2] - PLD 1992 SC 595

بھی کہ دستور کی دو دفعات کے درمیان تصادم پایا جاتا ہے، قرار دیا کہ ان میں سے ایک دفعہ کو دوسری دفعہ پر فوقیت نہیں دی جاسکتی کیونکہ دستور ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے عدالت نے قرار دیا کہ اس تصادم کو دور کرنے کا فورم پارلیمنٹ ہے۔
یہ فیصلہ کئی لحاظ سے انتہائی غلط ہے :

اولاً : جب عدالت نے طے کیا کہ ان دفعات کے درمیان تصادم موجود ہے تو یہ اس کی ذمہ داری ہوگئی کہ وہ دستور کی اس طرح تعبیر کرے کہ ان دفعات کے درمیان تصادم دور ہو جائے۔ عدالت نے یہ معاملہ پارلیمنٹ کے سپرد کرکے درحقیقت اپنی دستوری ذمہ داری پوری کرنے سے گریز کیا ہے۔

ثانیاً : عدالت نے کئی مواقع پر دستور کی دو دفعات کے درمیان پایا جانے والا ظاہری تعارض رفع کیا ہے۔ چنانچہ کبھی عدالت ایک دفعہ کو عام اور دوسری کو خاص قرار دے کر عام کی تخصیص کر دیتی ہے، اور کبھی ایک کو مطلق اور دوسری کو مقید قرار دے کر مطلق کو مقید پر محمول کر دیتی ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر عدالت نے دستور کی ایک دفعہ کو اس بنیاد پر معطل بھی کیا ہے کہ یہ دستور کی ایک دوسری دفعہ سے متصادم ہے۔ مثال کے طور پر دستور کی دفعہ ۲۰۹ کی ذیلی دفعہ ۷ کے تحت قرار دیا گیا ہے کہ اعلیٰ عدالتوں سے ججوں کو صرف سپریم جیوڈیشل کونسل کے فیصلے ہی کے ذریعے برطرف کیا جاسکتا ہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے جب وفاقی شرعی عدالت بنائی تو دستور میں آٹھویں ترمیم کرکے دفعہ ۲۰۳۔ سی کی ذیلی دفعہ ۵ بھی شامل کی جس میں قرار دیا کہ اگر ہائی کورٹ کے کسی جج کو شریعت کورٹ ٹرانسفر کیا جائے اور وہ وہاں چارج لینے سے انکار کرے تو اسے اپنے عہدے سے برطرف سمجھا جائے گا۔ سپریم کورٹ نے مشہور کیس الجہاد ٹرسٹ بنام وفاق پاکستان، جو ''ججز کیس'' کے نام سے مشہور ہے،[3] میں طے کیا کہ اس مؤخر الذکر دفعہ پر عمل نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ دستور کی اصل دفعہ ۲۰۹ سے متصادم ہے اور موجودہ پارلیمنٹ دستور میں ایسی ترمیم نہیں کرسکتی جو دستور کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی لائے کیونکہ اس پارلیمنٹ کے پاس قانون سازی کا اختیار تو ہے لیکن نئی دستور سازی کا اختیار اس کے پاس نہیں ہے۔ اب دفعہ ۲۰۳۔ سی کی ذیلی دفعہ ۵ دستور میں موجود ہے لیکن عملاً غیر مؤثر ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ دفعہ باقی التلاوۃ منسوخ الحکم ہے۔

ثالثاً: قرارداد مقاصد کو دفعہ ۲۔ الف کے ذریعے دستور کا باقاعدہ حصہ بنانے کے پیچھے واحد سبب یہی تھا کہ سپریم کورٹ نے ضیاء الرحمان کیس[4] میں طے کیا تھا کہ دستور کا دیباچہ ہونے کی وجہ سے اسے دستور کے متن پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ چاہیے یہ تھا کہ عدالت mischief rule کے تحت قرار دیتی کہ پارلیمنٹ نے قرارداد مقاصد کو اس لیے دستور کا باقاعدہ حصہ بنایا ہے کہ وہ اسے دستور کی دیگر دفعات پر فوقیت دینا چاہتی ہے۔ اگر باقاعدہ حصہ بنا دینے کے بعد بھی اس کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا تو پھر اس ترمیم کی ضرورت کیا تھی؟ یہ تعبیر قانون کا مسلمہ اصول ہے کہ مجلس قانون ساز کی طرف بے فائدہ اور لغو کام کی نسبت نہیں کی جائے گی۔

---

[3] - PLD 1996 SC 324
[4] - PLD 1973 SC 49

رابعا: اگرچہ عدالت نے قرار دیا ہے کہ دستور کی ایک دفعہ کو دوسری دفعہ پر فوقیت نہیں دی جاسکتی لیکن عملاً ہوا یہ ہے کہ دفعہ ۴۵ کو دفعہ ۲۔الف پر فوقیت دے دی گئی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جب عدالت نے ان دفعات کے درمیان تصادم کے اعتراف کے باوجود اس تصادم کو دور نہیں کیا تو گویا اب ایک ہی کام ایک دفعہ کے تحت جائز اور دوسری دفعہ کے تحت ناجائز ہے۔اگر صدر نے قصاص کے مقدمے میں اولیاء الدم کی مرضی کے بغیر قاتل کو معاف کیا تو کیا یہ فعل اس کے لیے جائز ہوگا؟ دفعہ ۲۔الف کے تحت وہ اس کام کا اختیار نہیں رکھتا جبکہ دفعہ ۴۵ کے تحت اس کا یہ اقدام دستور کے عین مطابق ہوگا !

بنیادی تصورات کا تصادم

دراصل عدالت اس مسئلے کو اس وجہ سے حل نہیں کرسکی کہ یہ تصادم صرف دو دفعات کے درمیان نہیں ہے بلکہ درحقیقت تصادم دو مختلف نظام ہائے قانون کے اصولوں کے درمیان ہے جن کو مصنوعی طریقے سے ایک جگہ سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔بہ الفاظ دیگر، اصل مسئلہ دو مختلف نظام ہائے قانون کے اصولوں کے درمیان تلفیق کا ہے۔دفعہ ۴۵ میں مذکور اصول دراصل انگریزی دستوری قانون کے ایک قاعدے کا لازمی نتیجہ ہے۔وہ قاعدہ یہ ہے کہ ریاست حاکمیت اعلیٰ کی حامل ہے۔ظاہر ہے کہ حاکمیت اعلیٰ پر کوئی قدغن نہیں لگائی جاسکتی۔نیز چونکہ حاکمیت اعلیٰ ہی عدل اور قانون کا سرچشمہ ہے اس لیے حاکمیت اعلیٰ کے حامل کی جانب سے کیا گیا ہر کام جائز ہوتا ہے (The king can do no wrong!)۔ریاست کا سربراہ ریاست کی حاکمیت اعلیٰ کا مظہر ہوتا ہے۔اس لیے اس کے پاس عفو کا یہ مطلق اختیار ہوتا ہے۔برطانیہ اور پاکستان میں وزیر اعظم حکومت کا سربراہ ہوتا ہے جبکہ ریاست کی سربراہی برطانیہ میں ملکہ کے پاس اور پاکستان میں صدر کے پاس ہوتی ہے۔چنانچہ برطانیہ میں عفو کا یہ اختیار ملکہ کے پاس اور پاکستان میں صدر کے پاس ہوتا ہے۔امریکہ میں صدر بیک وقت ریاست کا بھی سربراہ ہوتا ہے اور حکومت کا بھی، اس کے باوجود وہاں یہ اختیار صدر ہی کے پاس ہوتا ہے۔دوسری طرف قرارداد مقاصد کے پہلے پیرا میں قرار دیا گیا ہے کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔چنانچہ اصل میں تصادم دو جزئیات کے درمیان نہیں بلکہ دو بنیادی تصورات کے درمیان ہے۔شاید عدالت اس تصادم کو اس وجہ سے دور نہیں کرسکی کہ وہ خود اس معاملے میں تذبذب یا الجھن کا شکار تھی۔خود قرارداد مقاصد کے متن سے ظاہر ہے کہ اس کا مسودہ لکھنے والے بھی اسی الجھن میں مبتلا تھے کیونکہ اس میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا اعلان کیا جاتا ہے اور دوسری طرف ریاست پاکستان کے لیے sovereign right جیسی تراکیب بھی استعمال ہوئی ہیں۔

عفو و صلح کے قانون کا غلط استعمال

جہاں تک عفو اور صلح کے قانون کے غلط استعمال کا تعلق ہے تو یہ بات صرف اسی قانون کے متعلق صحیح نہیں ہے، بلکہ ہر قانون کو غلط طریقے سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔عفو اور صلح کی وجہ سے خاندانوں کے درمیان دشمنی در دشمنی کے طویل سلسلوں کا خاتمہ ممکن ہو جاتا ہے۔اگر کہیں اس کا غلط استعمال ہو رہا ہے تو اسے روکنے کے لیے مناسب اقدامات ضروری ہیں مگر اس کے لیے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جانا چاہیے جو قانون کا حلیہ ہی بگاڑ دے۔خود قصاص و دیت ایکٹ میں اس سلسلے میں چند

دفعات دی گئی تھیں۔ مثلاً تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۱۱ میں قرار دیا گیا ہے کہ اگر اولیاء میں سے بعض نے مجرم کو معاف کیا، یا اس کے ساتھ صلح کی، اور اس وجہ سے قصاص ساقط ہو جائے تو عدالت حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے "فساد فی الارض" کے خاتمے کے لیے مجرم کو مناسب تعزیری سزا سنا سکتی ہے۔ پہلے اس دفعہ میں فساد فی الارض کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی تھی :

> For the purpose of this section, the expression fasad-fil-arz shall include the past conduct of the offender as being a previous convict, habitual or professional criminal and the brutal manner in which the offence is committed.

واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اس دفعہ میں قاعدۂ سیاستہ کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔[5] تاہم یہ کوشش ناقص ہے کیونکہ سیاستہ کو یہاں بہت محدود مفہوم میں لیا گیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۷ء میں اس میں ترمیم کر کے "فساد فی الارض" کے مفہوم کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔ ترمیم شدہ متن یہ ہے:

---

[5]-علامہ ابن عابدین شامی اس تصور کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں :

فالسیاسة استصلاح الخلق بارشادهم الی الطریق المنجی فی الدنیا و الآخرة -(ردالمحتار (القاهرة: مصطفی البابی الحلبی، س ن، کتاب الحدود، ج ۳، ص ۱۶۲ [پس سیاستہ سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو دنیا و آخرت میں نجات دینے والا راستہ دکھا کر ان کی اصلاح کی جائے۔]

آگے ابن عابدین نے ایک اور تعریف نقل کی ہے : السیاسة تغلیظ جنایة لها حکم شرعي حسماً لمادة الفساد -(ایضاً)
[سیاستہ کسی ایسے جرم کی، جس کے متعلق شرعی حکم موجود ہو، سخت سزا کو کہتے ہیں جو فساد کے خاتمے کے لیے دی جائے۔]

اس تعریف کی وضاحت کرتے ہوئے ابن عابدین کہتے ہیں :

و قوله(لها حکم شرعی)معناه انها داخلة تحت قواعد الشرع و ان لم ینص علیها بخصوصها،فان مدار الشریعة بعد قواعد الایمان علی حسم مواد الفساد لبقاء العالم (ایضاً) [اس تعریف میں "جس کے لیے شرعی حکم موجود ہو" سے مراد یہ ہے کہ سیاستہ کا اختیار شرعی قواعد کے ماتحت ہوگا خواہ اس کے لیے خصوصی طور پر کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو، کیونکہ ایمان کی پختگی کے بعد شریعت کا مدار اسی پر ہے کہ دنیا سے فساد کا خاتمہ کیا جائے۔]

ابن نجیم نے یہی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی ہے :

و ظاهر کلامهم ههنا أن السیاسة : هي فعل شیء من الحاکم لمصلحة یراها و ان لم یرد بذلك الفعل دلیل جزئي-(البحر الرائق شرح کنزالدقائق، کتاب الحدود (بیروت: دارالمعرفة، تاریخ ندارد) ،ج ۵، ص ۱۱) [یہاں فقہا کے کلام کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ سیاستہ سے مراد حاکم کا وہ اقدام ہے جو وہ کسی مصلحت کی بنیاد پر اٹھائے خواہ اس مخصوص فعل کے لیے کوئی خاص نص نہ پائی جائے ۔]

یوں سیاستہ کا تصور کافی وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ تاہم بالخصوص فوجداری قانون کے حوالے سے جب اس اصطلاح کا استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد وہ سزائیں ہیں جو حاکم شرعی قواعد کی روشنی میں فساد فی الارض کے خاتمے کے لیے مقرر کرتا ہے۔ اس قاعدے کے تحت حکمران کو صرف سزا دینے ہی کا اختیار حاصل نہیں ہے بلکہ جرائم کی روک تھام کے لیے بھی وہ مناسب احتیاطی اقدامات (preventive measures) اٹھا سکتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد مشتاق احمد، "آبروریزی کے جرم کی شرعی تکییف"، معارف اسلامی، ج ۹، نمبر ۱ (جنوری۔ جون ۲۰۱۰ء) ۔ ص ۴۳۔

For the purpose of this section,the expression fasad-fil-arz shall include the past conduct of the offender,or whether he has any previous convictions,or the brutal or shocking manner in which the offence is committed which is outrageous to the public consience, or if the offender is considered a potential danger to the community.

۲۰۰۵ء میں اس میں مزید ترمیم کر کے غیرت کے نام پر قتل کو بھی "فساد فی الارض" کے مفہوم میں داخل کر دیا گیا ہے۔

عفو کا اختیار کس کے پاس ہے؟ تعزیراتِ پاکستان اور قانون شہادت کی دفعات کا تجزیہ

باقی رہی یہ بات کہ عفو کا اختیار ریاست کے بجائے مجنی علیہ اور اولیاء الدم کو دیا گیا ہے تو اس کی وجہ واضح ہے۔ انگریزی قانون کی رو سے دیگر جرائم کی طرح قتل کا جرم بھی ریاست کے حق کے خلاف اقدام متصور کیا جاتا ہے، جبکہ اسلامی قانون کی رو سے بنیادی طور پر یہ جرم اللہ اور بندے کے ایسے مشترک حق پر حملہ ہے جس میں بندے کا حق غالب ہے۔ اس لیے اس جرم کی معافی کا حق مجنی علیہ، یا اس کی عدم موجودگی کی صورت میں، اولیاء الدم کو حاصل ہے۔ اگر اس میں حق اللہ غالب ہوتا تو حد قذف کی طرح اس کی معافی کا اختیار بھی کسی کے پاس نہ ہوتا۔ ہاں، بعض اوقات اس جرم کو اسلامی قانون پورے معاشرے کے خلاف جرم قرار دیتا ہے، جس کی وجہ سے حاکم کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ مجرم کو مناسب سزا دے۔ چنانچہ ایسی بعض صورتوں میں وہ سزا میں تخفیف بھی کر سکتا ہے اور بعض سنگین صورتوں میں وہ سزائے موت بھی دے سکتا ہے۔

تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ کے تحت دو صورتوں میں قتل عمد کے جرم پر سزائے موت دی جا سکتی ہے:

ذیلی دفعہ الف کے تحت بطور قصاص؛ اور ذیلی دفعہ ب کے تحت بطور تعزیر جب قانون شہادت آرڈر ۱۹۸۴ء کی دفعہ ۱۷ میں مطلوب معیار ثبوت میسر نہ ہو۔ قانون شہادت آرڈر ۱۹۸۴ء کی دفعہ ۱۷ کو اسی آرڈر کی دفعہ ۳ کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ دفعہ ۳ میں قرار دیا گیا ہے کہ گواہوں کی اہلیت اور تعداد کے متعلق قرآن و سنت میں مذکور احکام اسلام کی پیروی کی جائے گی، البتہ اسلامی قانون کے مقرر کردہ معیار پر گواہ میسر نہ ہوں تو عدالت دوسرے طرق اثبات کو استعمال کر سکتی ہے۔

۲۔ دفعہ ۱۷ کی پہلی ذیلی شق میں بھی تقریباً اسی بات کو دہرایا گیا ہے۔

۸۰۔

۳ ۔دفعہ ۷اکی ذیلی شق ۲میں قرار دیا گیاہے کہ حدود قوانین یاکسی اور خصوصی قانون کے تحت گواہی کا جو معیار مقرر کیا گیاہو اس کی پیروی کی جائے گی۔

۴ ۔اسی شق میں قرار دیا گیاہے کہ مالیاتی امور سے متعلق دستاویز تحریر کرتے وقت دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی درکار ہے۔

۵ ۔اس شق میں مذکور آخری اصول یہ ہے کہ بقیہ تمام مقدمات اور معاملات میں عدالت مناسب سمجھے تو ایک مرد یا ایک خاتون کی گواہی یا واقعاتی شہادت کی بنیاد پر سزا سنا سکتی ہے۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ قصاص کی سزا کے لیے ضروری نہیں ہے کہ دو مرد ہی گواہی دیں، بلکہ تنہا خاتون کی گواہی یا واقعاتی شہادت کی بنیاد پر بھی یہ سزا سنائی جاسکتی ہے ؟اس سوال پر پاکستان میں مختلف عدالتوں نے مختلف فیصلے سنائے ہیں۔ چنانچہ آزد جموں و کشمیر کی شریعت کورٹ نے ۱۹۸۶ءمیں ایک مقدمے میں قرار دیا

> ''حدود و قصاص کے معاملات میں عورت / عورتوں کی گواہی مقبول نہیں ہے۔ اگر استغاثہ عورت گواہوں کو پیش کرے تو ان کے بیانات قلمبند کیے جاسکتے ہیں لیکن جہاں مرد گواہان موجود ہوں اور وہ دو سے کم نہ ہوں، تو عورتوں کے بیانات نہ لیے جائیں ۔۔۔ عورتوں کی گواہی پر کسی بھی شخص کو حد یا قصاص کی سزا نہیں دی جاسکتی۔'' [6]

اس کیس میں عدالت نے اسلامی قانون کی رو سے تو اس مسئلے کا تجزیہ کیا ہے لیکن چونکہ قانون شہادت آرڈر ۱۹۸۴ء آزاد کشمیر میں نافذ نہیں تھا اس لیے عدالت دفعہ ۱۷ (۲) کے اسلامی قانون سے تصادم یا عدم تصادم کا فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ تاہم فاضل عدالت نے قرار دیا کہ دو مردوں، یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کے اصول کو صرف مالیاتی مقدمات تک محدود کر دینا ''شریعت مطہرہ کے مفہوم اور مقصد'' کے خلاف ہے۔ [7] غالباً فاضل عدالت رائے کی بنیاد یہ امر ہے کہ اس شق کی تعبیر دفعہ ۳اور دفعہ ۱۷ (۱) کی روشنی میں ہونی چاہیے جن میں قرار دیا گیاہے کہ گواہوں کی اہلیت اور تعداد کے لیے اسلامی قانون کی پیروی کی جائے گی۔

وفاقی شرعی عدالت نے رشیدہ پٹیل کیس میں تمام تر بحث حدود کے نصاب شہادت پر کی تاہم ضمنی طور پر (obiter dictum) قصاص کے نصاب شہادت کا ذکر بھی اس فیصلے میں آیا۔ چنانچہ عدالت نے قرار دیا کہ مخصوص حالات میں خواتین کی گواہی حدود و قصاص سمیت سب معاملات میں لی جاسکتی ہے۔

---

[6]۔سرکار بنام نذیر PLD 1986 Shariat Court (AJ&K) 143 at 199

[7]۔ایضاً، ص ۱۹۴۔ ''غلام مرتضیٰ بنام سرکار'' میں جسٹس تنزیل الرحمان نے قرار دیا کہ چونکہ دفعہ ۱۷ (۲) کی شریعت سے مطابقت یا تصادم کا مسئلہ عدالت میں زیر بحث نہیں آیا اس لیے عدالت اس مسئلے پر کوئی فیصلہ نہیں دے سکتی لیکن اس مخصوص مقدمے کی حد تک مخصوص حالات کی بنا پر تنہا مرد کی گواہی کی بنیاد پر سزا بھی نہیں سنائی جاسکتی۔ (PLD 1989 Karachi 293 at 297)

البتہ ایسی شہادتوں کی بنیاد پر حد کی سزا نہیں دی جاسکتی اور صرف تعزیری سزا کے لیے انہیں قبول کیا جائے گا۔[8]
اس سلسلے میں ایک اور اہم فیصلہ سندھ ہائی کورٹ کا ہے۔ ''محبت بنام سرکار'' میں عدالت نے قرار دیا کہ قانون شہادت کی دفعہ ۱۷ کے تحت یہ اصول طے کیا گیا ہے کہ ثبوت کے لیے گواہوں کی تعداد کے بجائے ان کی گواہی کے وزن کو دیکھا جائے گا۔

> Mere quantity of evidence leads us nowhere. As a rule, witnesses are weighed and not numbered. Under Article 17 of the Qanun-e-Shahadat, 1984, no particular number of witnesses is required for the proof of a murder charge. Volume and weight of the evidence may be considered together, but if there is a conflict between the two, the quantity will certainly give way to quality.[9]

آگے چل کر عدالت نے قرار دیا ہے کہ اس اصول کی روشنی میں محض واقعاتی شہادت کی بنا پر بھی عدالت سزائے موت سنا سکتی ہے۔

ہماری رائے اس سلسلے میں یہ ہے کہ فاضل عدالت نے قانون شہادت کی دفعہ ۱۷ کا مفہوم متعین کرنے میں غلطی کی ہے۔ اگر واقعی دفعہ ۱۷ کے تحت قصاص کے مقدمے میں گواہوں کی کوئی خاص تعداد ضروری نہیں قرار دی گئی اور محض واقعاتی شہادت کی بنا پر بھی قصاص کی سزا سنائی جاسکتی ہے تو پھر تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ ب میں یہ کیوں ذکر کیا گیا کہ جب قانون شہادت کی دفعہ ۱۷ کے تحت مقررہ نصاب کے مطابق ثبوت میسر نہ ہو تو عدالت دستیاب شہادتوں کی بنیاد پر بطور تعزیر سزائے موت سنا سکتی ہے؟ کیا اس کا واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ دفعہ ۱۷ کے تحت قصاص کے اثبات کے لیے کوئی خاص معیار مقرر کیا گیا ہے جو عام حالات میں دستیاب نہیں ہوتا، اس لیے عام حالات میں دیگر قرائن کی بنیاد پر بھی سزائے موت سنائی جاسکتی ہے لیکن وہ قصاص نہیں ہوگی؟

قانون شہادت کی دفعہ ۱۷ کا جائزہ لیجیے تو اس میں صراحتاً قرار دیا گیا ہے کہ ہر مقدمے میں بنیادی طور پر شریعت کے مقرر کردہ نصاب شہادت کی پیروی کی جائے گی۔ حدود اور خصوصی قوانین کے ساتھ قصاص کے عدم ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ قصاص کے لیے کوئی خاص ضابطہ مقرر نہیں کیا گیا۔ اگر قصاص کے اثبات کے لیے دفعہ ۱۷ کے تحت کوئی خاص ضابطہ مقرر نہ ہوتا تو پھر تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ ب میں اس دفعہ کی طرف اشارہ بالکل لغو اور بے معنی ہو جاتا ہے، اور یہ تعبیر قانون کا مسلمہ اصول ہے کہ مجلس قانون ساز کی طرف لغو کام کی نسبت نہیں کی جائے گی۔

---

[8] - PLD 1989 FSC 95 at 128

[9] - محبت بنام سرکار 1990 PCrLJ 73 at 77

مزید برآں، فاضل عدالت کی یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ گواہوں کی تعداد سے زیادہ اہم بات ان کی گواہی کا وزن ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تعداد کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر زنا کے جرم کے اثبات کے لیے قرآن مجید کی نص صریح نے چار گواہوں کی گواہی لازم ٹھہرائی ہے۔ اس لیے گواہ چار سے کم ہوں تو ان کی گواہی کا وزن دیکھا ہی نہیں جائے گا بلکہ انہیں قذف کی سزا دی جائے گی۔ البتہ تعداد چار یا زائد ہو تو پھر ان کی گواہی کے وزن کو دیکھا جائے گا۔ اسی طرح قصاص کی سزا کے لیے دو مرد گواہ درکار ہیں۔ وہ نہ ہوں تو چاہے قرائن اور واقعاتی شہادتوں کا انبار بھی لگا دیا جائے، قصاص کی سزا نہیں دی جائے گی۔

عدالت نے قرار دیا ہے کہ بعض مخصوص حالات میں محض قرائن اور واقعاتی شہادتوں کی بنیاد پر بھی سزائے موت سنائی جاسکتی ہے۔ ان حالات کی وضاحت کرتے ہوئے عدالت نے کہا ہے:

> A conviction may be based on circumstantial evidence alone, but to establish an offence by circumstantial evidence four things are essential:(i)The circumstances from which the conclusions are drawn should be fully established. (ii) All the facts must be consistent with the hypothesis. (iii) The circumstances should be conclusive in nature and tendency. (iv) The circumstances should, to a moral certainty, actually exclude every hypothesis, but the one proposed to be proved.[10]

ہمیں فاضل عدالت کی اس تحقیق سے سو فی صد اتفاق ہے۔ البتہ ہمارا موقف یہ ہے کہ اس سزائے موت کو قصاص نہیں کہا جاسکتا۔ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ ب میں اسے تعزیر قرار دیا گیا اور اس کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ در حقیقت یہ سیاسۃً قتل کی ایک صورت ہے۔ پس اصول یہ ہوا کہ اگر جرم قاتل کے اقرار یا دو ایسے مرد عینی گواہوں کی گواہی سے، جو تزکیۃ الشہود کے معیار پر پورا اتریں، ثابت نہ ہو، لیکن عدالت کے نزدیک دیگر قرائن اور شہادتوں کی بنیاد پر یہ بات یقینی ہو کہ ملزم نے قتل کا ارتکاب کیا ہے اور اسے کوئی رعایت نہیں دی جاسکتی، تو عدالت اسے سزائے موت سنا سکتی ہے۔ یہ سزائے موت بطور قصاص نہیں بلکہ بطور سیاسۃ دی جائے گی۔

---

[10] ۔ ایضاً، ص ۷۸

یہیں سے اس مسئلے کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ اگر یہ سزائے موت بطور سیاسۃ دی جا رہی ہے تو اس میں عفو کا اختیار بھی مقتول کے ورثا کے بجائے حکومت کے پاس ہے۔ اب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قتل کے مقدمات میں قصاص کے لیے مطلوبہ معیار کے مطابق ثبوت شاذ و نادر ہی دستیاب ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قتل کے اکثر مقدمات میں سزائے موت قصاصاً نہیں بلکہ سیاسۃً سنائی جاتی ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر ایسے تمام مقدمات میں عفو کا اختیار حکومت کے پاس ہے نہ کہ مقتول کے ورثا کے پاس۔ واللہ أعلم۔